© rasailojaraid.com

ثابت قدم رہیں اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو سچے ہیں اور یہی پرہیزگار لوگ ہیں)۔

میرے خیال میں مذکورہ آیہ مبارکہ میں جو باتیں بیان کیا گئی ہیں وہ اس قدر جامع ہیں کہ معاشرہ کے تمام طبقوں اور افراد کے حقوق وفرائض انفرادی اور اجتماعی تمام ذمہ داریاں بہت ہی خوبصورت انداز میں بیان کی گئی ہیں۔ اگر حاکم اور رعایا اس آیت کو منشور قرار دے کر اسی کی روشنی میں اپنے اعمال کا احتساب کریں تو اسلامی فلاحی مملکت کے قائم ہونے اور کامیاب کامران ہونے میں کسی شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی کیونکہ ایسی مملکت میں اللہ کی خوشنودی بھی حاصل رہے گی کیونکہ ہر طرف دین الٰہی کا پرچار ہوگا کمزور یا طاقتور ہر ایک کو اس کا حق ملے گا معاشرہ سے برائی کا مکمل خاتمہ ہوگا پورا معاشرہ خیر وبرکت سے معمور ہوگا۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہمیں ایسی ہی مملکت کے قیام کی تمنا اور آرزو کے لئے برابر دعا کرنے کی تلقین ان الفاظ میں کی ہے یہی ہم سب کی ہمیشہ آرزو ہونی چاہیے۔

(اللھم انا نرغب الیک فی دولۃ کریمۃ تعزبہ الاسلام واھلہ و تذل بہ النفاق واھلہ وتجعلنا فیھا من الدعاۃ الی طاعتک ، والقادۃ الی سبیلک ، وترزقنا فیھا کرامۃ الدنیا والاخرۃ)۔

اے اللہ ہم تجھ سے ایسی بابرکت مملکت کی آرزو رکھتے ہیں کہ جس میں اسلام اور اہل اسلام دونوں باعزت رہیں نفاق اور منافقین ذلیل ہوں۔ اور تو (مہربانی فرما کر) ہم کو سرکشی سے اپنی اطاعت کی طرف آمادہ کرے، اور تیرے راستے کے رہبر بنادے اور تو ہمیں دنیا وآخرت دونوں کی عزت وآبرو عطا فرما۔

آمین ثم آمین یارب العالمین

نادان دل کو مرگ کا اب تک یقین نہیں

علامہ محمد جعفر شاہ ندوی پھلواری

عجیب توافق

۱۹۴۷ء میں جب قیام پاکستان کا اعلان ہوا تھا تو جمعۃ الوداع کا دن تھا اور ۲۶ ویں رمضان۔ ستائیسویں شب رمضان کو جسے عام طور پر شب قدر بھی کہا جاتا ہے قیام پاکستان کا اعلان ہوا۔ آج تیرہ سال بعد ۱۹۶۰ء میں اسی چھبیسویں رمضان کو جمعۃ الوداع تھا۔ دن اور رات کا اتصال عین افطار کے وقت ہوا اور ستائیسویں شب رمضان کا آغاز ہوا۔ عین افطار کے وقت ایک مریضہ نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی۔ اور اپنے چھتیس سالہ رفیق زندگی شوہر کا رشتہ رفاقت ہمیشہ کے لیے منقطع کرلیا۔ شوہر کی زبان پر اس وقت بے ساختہ مولانا تمنا پھلواری کا یہ شعر آگیا

ماتیخ ذوق فنا تھا صوم یک روزہ حیات
موت کیا آئی ساعت آگئی افطار کی

اس مرنے والی کا ذکر اس لیے نہیں کر رہا ہوں کہ قدرت نے اس کے لیے بڑی قابل رشک ساعت کا انتخاب کیا۔ عین اسی وقت اور بھی ہزاروں موتیں دنیا میں ہوئی ہوں گی۔ ہمارا جو کچھ مقصد ہے وہ بالکل الگ ہے۔

انسانی بے بسی

مریضہ سات آٹھ ماہ تک بیمار رہی۔ اسے حلق کا کینسر ہوگیا تھا۔ یہ مرض کم از کم اس وقت تک میڈیکل سائنس کی بے بسی اور ناکامی کا سب سے واضح اعلان ہے۔ سائنس والے اپنے مصنوعی سیارے سورج کے مدار تک پہنچانے میں تو کامیاب ہوگئے لیکن زمین پر بسنے والوں کے ایک معمولی مرض زکام پر قابو نہ پاسکے۔ انسان کتنا بڑا اقادر اور پھر کتنا بے بس ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غلط فہمی

مرحومہ کو ہوتو گیا تھا کینسر، لیکن ہمیں برابر یہی غلط فہمی رہی کہ مریضہ بہر حال اچھی ہو جائے گی۔ اس غلط فہمی کی بڑی وجہ مرحومہ کی وہ باتیں ہیں جو انہوں نے مجھ سے وقتاً فوقتاً بیان کیں۔

مرحومہ نے مجھ سے اپنا پہلا خواب یوں بیان کیا:

پہلا خواب

دیکھتی کیا ہوں کہ میری چارپائی کے پاس نیچے ایک بلی ہے جس کی طرف میں ہاتھ بڑھانا چاہتی ہوں تو جو لوگ وہاں موجود تھے انہوں نے کہا کہ ارے اسے ہاتھ نہ لگانا یہ تو بلا ہے۔ میں نے اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا یہ بلا تو نہیں ایرانی بلی معلوم ہوتی ہے۔ دیکھو اس کے بال کتنے بڑے اور نرم ہیں پھر میں نے انسانی بچے کی طرح اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھانا چاہا تو وہ قد و قامت میں بڑھنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے شیر سے بھی کئی گنا بڑھ گئی۔ اس وقت خیال آیا کہ فی الواقع کوئی بلا ہے۔ پھر میں نے فوراً ہی اپنی انگشت شہادت سے اشارہ کرتے ہوئے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھنا شروع کیا اس طرح کہ لا الہ الا اللہ کہہ کر اسے گویا اوپر سے نیچے اشارے سے کاٹا اور محمد رسول اللہ کہہ کر دائیں سے بائیں اشارے سے کاٹا۔ اسی وقت خواب ہی میں مجھے اپنی والدہ مرحومہ کا بھی یہ خواب یاد آیا کہ انہوں نے عرصہ ہوا خواب میں ایک بدہیئت سیاہ فام مرد یا عورت کو دیکھا جس کے سر پر گھڑا رکھا تھا۔ اس گھڑے پر اور اس شخص کی پیشانی پر "طاعون" لکھا ہوا تھا۔ والدہ نے اسے اسی طرح لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ کر کاٹا۔ تو چیختا چلاتا بھاگا۔ اس کے بعد لکھنؤ میں بڑے زوروں سے طاعون پھیلا۔ مگر الحمد للہ والدہ کے گھرانے کے تمام لوگ محفوظ رہے مجھے اپنی والدہ کا خواب اسی خواب میں یاد آیا اور میں بھی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ پڑھ کر اس عظیم الجثہ بلی کو اشارے سے کاٹتی رہی۔ ذرا دیر میں وہ بڑا مسلا ہوا کاغذ سی بن گئی پھر دھواں بن کر فضا میں تحلیل ہو گئی۔

دوسرا خواب

پھر ایک دن مرحومہ نے دوسرا خواب بیان کیا کہ ایک عورت اندر آئی اور میری چارپائی پر بیٹھ گئی میں نے اس سے دریافت کیا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا میں تمہاری صحت ہوں۔ بہت دنوں سے تمہیں ڈھونڈ رہی ہوں شکر ہے کہ آج تم مل گئیں۔

تیسرا خواب

پھر ایک دن تیسرا خواب یوں بیان کیا کہ:

ایک جنازہ جا رہا ہے میں نے جنازہ لے جانے والوں سے دریافت کیا کہ یہ کس کا جنازہ ہے؟ اتنے میں کاندھا دینے والوں نے جنازہ چھوڑ دیا اور وہ جنازہ معلق خود ہی چلا جا رہا تھا ان میں سے دو آدمی خوش رو سفید پوش، سیاہ ریش میرے پاس آئے اور نظریں نیچی کر کے کہنے لگے کہ یہ آپ کی بیماری کا جنازہ ہے جسے ہم لوگ لیے جا رہے ہیں اور ہم کو بہت افسوس اور شرمندگی ہے کہ آپ کو بڑی تکلیف اٹھانی پڑی۔ ان خوابوں کو سننے کے بعد مجھے تقریباً سو فیصد یقین ہو گیا کہ یہ مریضہ ضرور اچھی ہو جائے گی کیونکہ بظاہر ان خوابوں سے اس کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔

ایک عامل

اس کے بعد میرے ایک عزیز کرم فرما۔ جو سائیکو پاسٹ، منجم، جفار اور بڑے "عامل" بھی ہیں۔ عیادت کے لیے آئے۔ انہوں نے پہلے شکایت کی کہ آپ نے اب تک مجھے بیماری کی کوئی اطلاع نہیں دی۔ اور میں فلاں صاحب سے سن کر آیا ہوں۔ پھر کہا رات میں نے چراغ کا ایک مخصوص عمل کیا تھا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اس کی روشنی سیاہ نہ تھی جو سخت خطرناک ہوتی ہے۔ بلکہ گلابی تھی جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ مریض قطعاً و یقیناً اچھا ہو جائے گا۔ ممدوح نے یہ بھی یقین دلایا کہ یہ باتیں محض تسکین کے لیے نہیں کہی جا رہی ہیں۔ ان کو مرحومہ سے اتنی زیادہ محبت تھی جتنی کسی سعادت مند فرزند کو اپنی لائق ماں سے ہوتی ہے۔

عرض یہ کرنا ہے کہ تینوں خواب اور یہ یقین دہانی ایسی تھی، جس کے بعد مریضہ کی تندرستی میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے مجھے آخر آخر وقت تک یہ یقین رہا کہ ہم اپنی استطاعت کے مطابق علاج معالجہ تو کر رہے ہیں جس سے اگرچہ حالت روز بروز خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی ہے لیکن کوئی نہ کوئی سبب اللہ تعالیٰ ضرور پیدا فرما دے گا جس سے مریضہ تندرست ہو جائے گی۔

ایک اور خواب

وفات سے کوئی ایک ہفتہ پہلے صوفی حاجی یار محمد خاں صاحب تاجر چوب جہلم کا ایک خط ملا جس میں ایک خواب یوں درج تھا۔

میں صبح کی نماز کے بعد سو گیا تو اپنے پیر و مرشد (حضرت قبلہ مولانا شاہ سلیمان پھلواری رحمتہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اللہ تعالیٰ علیہ) کو خواب میں دیکھا۔ حضرت موصوف کے ساتھ میں ایک جگہ گیا جہاں کچھ لوگ ہیں اور کچھ تھیلیاں پڑی ہوئی ہیں۔ وہاں پرچیاں ڈالی جارہی ہیں۔ ایک طرف آپ (یعنی محمد جعفر) کے حق میں پرچیاں ڈالی جارہی ہیں اور دوسری جانب آپ کے مخالف کے حق میں۔ آپ کی پرچیاں بہت زیادہ ہیں اور مخالف کی بہت کم نتیجے کا انتظار کیے بغیر ہی حضرت ممدوح وہاں سے روانہ ہوگئے۔ اور آپ (محمد جعفر) کے متعلق فرمایا کہ ان اللہ معہ (خدا اس کے ساتھ ہے) اس کے بعد صوفی صاحب موصوف نے اپنی کہی ہوئی تعبیر یہ دی کہ ان شاء اللہ آپ کی اہلیہ کے موذی مرض پر آپ کو فتح حاصل ہوگی۔

بظاہر یہ خواب بھی ایسا تھا جس نے میرے یقین میں اضافہ کردیا اور اب مجھے سو فیصد مریضہ کی تندرستی کا یقین ہوگیا۔ مگر۔ آہ۔ یہ سب کچھ رجائی جذبات کی کرشمہ سازیاں تھیں۔ جو سراب ثابت ہوئیں۔ مرحومہ کے خواب میں کوئی اشارہ مستقبل نہ تھے بلکہ اندرونی خواہشیں تھیں جو متشکل ہوکر نظر آگئیں اور صوفی صاحب کے خواب میں صرف نزول سکینہ کا اشارہ تھا کیونکہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق قرآن پاک میں جو کچھ ارشاد ہے وہ یوں ہے۔

اذ یقول لصاحبہ لا تحزن ان اللہ معنا فانزل اللہ سکینتہ علیہ
وایدہ بجنود لم تروھا.

وہ وقت یاد کرو جب رسول اللہ ﷺ اور اپنے ساتھی (سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے (غار ثور میں) کہہ رہے تھے کہ حزن نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے پس اللہ نے اس (سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ) پر اپنی سکینت نازل کی اور اس کی تائید ایسے لشکر سے کی جسے تم دیکھ نہیں سکتے تھے۔

نزول سکینہ

اس میں شک نہیں کہ میں خود اپنے ذہن کو اور اپنی سب سے چھوٹی اولاد اکلوتے ہشت سالہ فرزند محمد موسیٰ کے ذہن کو کئی ماہ سے تیار کر رہا تھا۔ لیکن خواب وخیال کی دنیا میں پڑے رہنے سے مجھے سو فیصد مرحومہ کی صحت کا یقین بھی تھا۔ اس امید کے بالکل خلاف اچانک یہ حادثہ پیش آنے کے بعد میرے دماغ پر غیر معمولی اور مجنون بنادینے والا اثر پڑنا چاہیے تھا۔ لیکن مجھ پر اتنا بھرپور نزول سکینہ ہوا کہ میں خود حیران ہوں اور اس سے زیادہ حیرت مجھے موسیٰ اے یتیم ولطیم کے اطمینان قلب پر ہے (جس نابالغ بچے کا باپ مرجائے وہ یتیم ہوتا ہے جس کی ماں مرجائے اسے لطیم کہتے ہیں اور جس کے ماں باپ دونوں مرجائیں اسے قطیع کہتے ہیں) اس ہشت سالہ بچہ سے میرا جو وقتاً فوقتاً مکالمہ ہوا اس کا خلاصہ سنیے۔

کوئی مرجاتا ہے تو جنت میں چلا جاتا ہے؟

ہاں بیٹے! اگر اچھا آدمی مرے تو وہ جنت میں جاتا ہے

پھر تو مرجانا اچھی ہی بات ہے

اور کیا

قبر میں آدمی سڑگل جاتا ہے نا؟

ہاں سڑگل جاتا ہے۔

تو پھر جنت میں کیا چیز جائے گی؟

یہ جسم تو فقط لباس ہے۔ آدمی کی روح یہ لباس چھوڑ کر دوسرا لباس پہن لیتی ہے اور جنت میں چلی جاتی ہے۔

میری یہ بات شاید پوری طرح اس کی سمجھ میں نہ آسکی مگر وہ خاموش ہوگیا اور سوچنے لگا۔ یہ گفتگو اس وقت ہوئی جب مرحومہ ابھی میو اسپتال میں تھیں۔

ماں کے انتقال کے بعد لوگوں کو روتا ہوا دیکھ کر مجھ سے پوچھا کہ یہ لوگ رو کیوں رہے ہیں؟ میں نے متوازن لہجے میں الگ لے جا کر بتایا کہ تمہاری باجی (مرحومہ کو ان کی ساری اولاد اور ان کے سب ملنے والے باجی کہا کرتے تھے) کا انتقال ہوگیا ہے نا۔ لوگ خواہ مخواہ رو رہے ہیں۔ یہ سن کر وہ زار زار رویا۔ میں نے اسے سمجھایا تو وہ ایک منٹ خاموش ہوگیا۔ اور مجھ سے ایک دلخراش سوال کیا کہ پھر اب میری ماں کون بنے گا؟ میں نے کہا میں تمہارا باپ بھی ہوں اور ماں بھی۔ اس کے علاوہ تمہاری تو بہت سی مائیں ہیں۔ تمہاری سب بہنیں بھی تو تمہاری مائیں ہی ہیں۔ اس کے بعد وہ مطمئن ہوگیا۔ اور اپنے عام مشاغل میں لگ گیا تھوڑی دیر کے بعد بہت سی عورتیں اور مرد جمع ہوگئے تو اس نے کہا۔

یہ لوگ رو کیوں رہے ہیں؟ باجی کو کتنی تکلیف تھی۔ اس سے نجات مل گئی۔ اس سڑی گلی دنیا سے وہ چلی گئیں۔ اب وہ بہت اچھی دنیا میں جا کر رہیں گی اس میں رونے کی کیا بات ہے؟

اس کے بالکل یہی الفاظ تھے جو میں نے نقل کیے ہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہورہا تھا کہ اس بچے کے اندر کسی اچھے فلسفی مومن کی روح بول رہی ہے وہ کھانا کھا کر سوگیا۔ صبح وہ خوش وخرم دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلتا رہا۔ دن کے ساڑھے بارہ بجے جنازہ اٹھنے لگا تو اس نے کہا کہ میں بھی ساتھ چلوں گا کیونکہ میں نے آج تک کوئی قبر نہیں دیکھی ہے۔ وہ جنازے کے ساتھ ساتھ قبرستان تک گیا۔ سب کے ساتھ نماز جنازہ ادا کی۔ دفن تک وہ ادھر ادھر مختلف قبروں کو دیکھتا رہا۔ سب مٹی ڈال چکے تو وہ بھی آیا اور اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے مٹی ڈالی۔ پھر اپنے نازک ہاتھوں سے پھولوں کی چادر کا ایک کونہ پکڑ کر چادر گل رکھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ہم سب کے ساتھ ہنستا کھیلتا گھر واپس آ گیا۔

عید کے دوسرے یا تیسرے دن وہ باصرار میرے ساتھ اپنی باجی کی قبر پر پھول چڑھانے گیا کچھ اور لوگ بھی تھے۔ اس وقت اس معصوم بچے نے مجھ سے پوچھا۔

اب اس قبر میں باجی پڑی ہوں گی؟

وہ یہاں کہاں؟ وہ تو جنت میں چلی گئیں۔

تو پھر اس میں کوئی چیز نہیں؟

قبر میں اب کیا رکھا ہے؟ اس کے بعد اس نے ایک عجیب سوال کیا

جب آدمی کو مرنا ہی ہے تو وہ پیدا کیوں ہوتا ہے؟

اللہ میاں اس لیے پیدا کرتے ہیں کہ دیکھیں آدمی اچھے کام کرتا ہے یا برے اگر اچھے کام کرے تو مرنے کے بعد جنت میں جاتا ہے اور برے کام کرے تو جہنم میں ڈال دیا جاتا ہے یہ قبر تو صرف ایک دروازہ ہے اس دروازے سے اچھے لوگ جنت میں جاتے اور برے جہنم میں پہنچ جاتے ہیں۔

غرض مجھ پر بھی عجیب نزول سکینہ تھا اور میرے فرزند پر تو اس سے بھی زیادہ نزول سکینہ آج تک ہے۔ اور میرے خیال میں صوفی صاحب کے خواب کی یہی تعبیر ہے۔

نتیجہ

اس داستان خواب کو بیان کرنے سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ نہ خوابوں پر زیادہ اعتماد کرنا چاہیے اور نہ خوابوں کی تعبیر پر۔ نہ ہر خواب کی تعبیر ضروری ہے اور نہ ہر تعبیر کا درست ہونا لازمی ہے۔ خواب اور اس کی تعبیر بالکل بے حقیقت چیز بھی نہیں لیکن اس پر زیادہ اعتماد کرنے سے بہت سی ذہنی اور عملی کمزوریاں پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ خواب و خیال کی دنیا میں جتنا زیادہ انہماک ہوگا۔ اتنا ہی دنیائے بیداری کے کارخانے میں خلاء پیدا ہو جائے گا۔ بلاشبہ دنیا امیدوں پر قائم ہے۔ لیکن موہوم توقعات میں کھو جانا بھی صحیح نہیں۔

تقریباً یہی حال کشوف کا بھی ہے۔ کشف وغیرہ پر بھی زیادہ اعتماد درست نہیں بعض اوقات تو خود صاحب کشف کشف کا مطلب نہیں سمجھتا اور بعض اوقات اس میں ایسا ابہام سا ہوتا ہے کہ اس میں کئی پہلو نکلتے ہیں۔ اور سننے والا اس سے جو مطلب اخذ کرتا ہے وہ غلط ثابت ہوتا ہے۔

یہ ہے وہ سبق جو مرحومہ کی موت مجھے دی گئی ہے۔ میں اسے اپنے تصور کو عام کرنے کی غرض سے شائع کر رہا ہوں۔ کوئی یوسف وقت ہو یا ابن سیرین جیسا تعبیر خواب کا ملکہ رکھتا ہو تو بے شک اس کی

تعبیروں پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ خوابوں یا اس کی سرسری تعبیروں پر بیداری کی زندگی کا دارومدار نہیں رکھنا چاہیے۔

ناقابل تلافی نقصان

مرحومہ کی وفات سے میرا جو ناقابل تلافی نقصان ہوا وہ علمی و ادبی نقصان ہے۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ سن لیجیے۔ ایک بار مرحوم ڈاکٹر عبدالحکیم نے مجھ سے کہا: بعض الفاظ ہم لوگوں کی زبان پر ایسے بھی جاری ہیں جن کے صحیح مفہوم سے ہم لوگ آشنا نہیں۔ بتائیے ہم "ملوہ مانڈہ" بولا کرتے ہیں۔ مانڈے کا کیا مطلب ہے؟ میں نے کہا کل بتاؤں گا۔ دوسرے دن انہیں بتایا کہ حلوے کے ساتھ جو بڑے بڑے پراٹھے ہوتے ہیں۔ انہیں "مانڈا" کہتے ہیں۔ پوچھا۔ یہ کس لغت میں دیکھا ہے؟ میں نے کہا۔ "زوج اللغات" میں۔ پوچھا یہ کونسا لغت ہے؟ میں نے کہا یہ صرف میرے پاس ہے یہ کوئی کتاب نہیں بلکہ میری زوجہ محترمہ ہے۔ جس محاورے، روزمرہ، ضرب الامثال، کہاوت، الفاظ، تذکیر و تانیث وغیرہ کا مجھے علم نہیں ہوتا یا مجھے شک رہتا ہے اسے میں اسی زوج اللغات سے دریافت کر لیتا ہوں۔ اردو زبان میں میری استانی وہی ہیں۔ مرحوم خلیفہ صاحب نے اس پر ایک فرمائشی قہقہہ لگایا، اس کے بعد بھی انہوں نے کئی موقعوں پر مجھ سے بعض باتیں دریافت کیں۔ مرحوم کی کتاب "فکر اقبال" پر ایک اخبار (ہماری زبان کراچی) نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس میں خلیفہ صاحب نے "غار" کو مذکر لکھا ہے حالانکہ یہ مؤنث ہے۔ خلیفہ صاحب نے ہم لوگوں سے دریافت کیا۔ مولانا رئیس احمد جعفری نے کہا کہ غار مذکر ہے۔ میں نے کہا میرے کان اس کی تانیث سے آشنا ہیں۔ مزید تصدیق زوج اللغات سے کی جائے گی۔ دوسرے دن "زوج اللغات" نے میری رائے کی تائید کی اور اتفاق سے اسی دن "جامع اللغات" سے بھی اس کی تصدیق ہو گئی۔

میں جب کپورتھلے (مشرقی پنجاب) میں تھا تو جناب خواجہ حسن نظامی نے میرے پاس ایک کتاب بھیجی کہ اس کتاب کی تصحیح کر کے اس کی زبان کو سہل بنا دیا جائے۔ اس میں بلا مبالغہ پچاسوں محاورات، ضرب الامثال اور کہاوتیں ایسی تھیں جن سے میں بالکل ناواقف تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دو چار مقامات کے سوا سارے مقامات مرحومہ ہی نے حل کیے تھے۔ ایک بار مولانا تمنا عمادی نے مجھے اپنی ایک غزل سنائی جس میں ایک مصرعہ یوں تھا

سایہ پڑا اپنا اب جو مرد ہو گیا

میں نے عرض کیا کہ مضمون کے متعلق تو کچھ عرض کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ لیکن ایک لفظ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کھٹکتا ہے۔ بڑا بڑا صحیح نہیں۔ کہنے لگے تم کوئی سند نہیں ہو۔ اندر جا کر دریافت کرو۔ میں نے جا کر اپنی زوج الملفات سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ بڑے بڑے ہونا چاہیے اس کے بعد مولانا ممدوح نے بھی تصحیح فرمائی۔

مجھے یاد ہے کہ کئی موقعوں پر میں نے مرحومہ سے کہا کہ فلاں لفظ جو تم بولتی ہو صحیح نہیں کیونکہ یہ فلاں قاعدے کے خلاف ہے۔ اس کا جواب انہوں نے ہمیشہ یہی دیا کہ قاعدہ و قانون آپ اپنے پاس رکھیے۔ یہ لفظ اس لیے صحیح ہے کہ میں یوں ہی بولتی ہوں۔ میری زبان قاعدے قانون سے نہیں بنی ہے۔ بلکہ قاعدے قانون میری زبان سے بنے ہیں۔ یہاں آ کر میرے پاس لاجوابی کے سوا اور کوئی جواب نہیں ہوتا تھا۔ میں نے انکی کئی باتوں کو تسلیم نہیں کیا۔ اس کے باوجود ماہنامہ مہر نیمروز (کراچی) کی اس بات سے اتفاق ہے کہ مرحومہ کو اردو زبان میں درجۂ استناد حاصل تھا۔

ادبی لطیفے

مرحومہ کے بعض ادبی لطیفے بھی خوب ہوتے تھے۔ ایک بار وہ کوئی مصفی دوا بنا رہی تھیں میں نے کہا اس میں نیم کی پتیاں بھی شامل کرلو۔ کہنے لگی یہ آپ کہاں سے نیم حکیم بن کر ٹپک پڑے؟

ایک بار لکھنو میں ڈاکٹر عبدالعلی صاحب (ناظم ندوۃ العلماء) نے انہیں بتایا کہ بکری کا کپاول پیس کر پی لیا کرو۔ مرحومہ نے برجستہ کہا۔ اس سے تو بزدل بن جانے کا بھی خطرہ ہے۔

مولانا عزیز الدین ندوی کی شادی شرف النساء سے ہوئی۔ مرحومہ نے مجھ سے کہا کہ میں ایک رومال کاڑھ رہی ہوں وہ انہیں میری طرف سے تحفے میں دے دیجیے گا۔ اس میں میں صرف ایک مصرعہ کاڑھنا چاہتی ہوں۔ میں نے پوچھا کون سا مصرعہ؟ کہنے لگیں: ''گر قبول افتد زہے عزّ و شرف''۔ میں مصرعے کے اس انتخاب پر پھڑک اٹھا۔

لائل پور کے ہفت روزہ ''المنبر'' نے مرحومہ کی تعزیت کرتے ہوئے صحیح لکھا تھا کہ۔ محمد جعفر کی ساری زندہ دلی اور شگفتگی مرحومہ ہی کے دم سے قائم تھی۔

فتوے کی اصلاح

سب سے زیادہ تعجب مجھے اس وقت ہوا جب مرحومہ نے میرے ایک فتوے کی اصلاح کی۔ وہیں کپور تھلے میں ایک بیوہ عورت کے (شوہر مرنے کے ڈیڑھ سال بعد) بچہ پیدا ہوا۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ حلالی ہے یا حرامی؟ میں نے اسکے پر لکھ دیا کہ حرامی ہے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ عورتوں کا معاملہ ہے ذرا

اپنی بیوی سے بھی پوچھ لوں۔ مرحومہ نے کہا آپ کا فتویٰ بالکل غلط ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ شوہر کے مرنے کے ڈیڑھ سال بعد جو بچہ پیدا ہو وہ ولدالزنا حرامی ہو۔ ہوتا یہ ہے کہ بعض اوقات رونے دھونے یا ہاتھ پاؤں پٹخنے سے خون جاری ہو جاتا ہے اور بچے کی پرورش نہیں ہو پاتی لیکن وہ تخم محفوظ رہتا ہے اور جب خون بند ہو کر اسے غذا ملنے لگتی ہے تو اس کی پرورش شروع ہو جاتی ہے اور وہ بالکل حلالی بچہ ہوتا ہے۔ جو بہت دنوں کے بعد وجود میں آ جاتا ہے۔ پھر کہا: یوں حرامی ہونے کا امکان تو اس وقت بھی ہے جب کہ شوہر زندہ ہو لیکن شوہر کی وفات کے بہت دنوں کے بعد پیدا ہونا حرامی ہونے کی دلیل بالکل نہیں۔ اس کے بعد مرحومہ نے کئی مثالیں دیں۔ ایک مثال خود اپنے گھر کی ایک خادمہ (امینہ) کی دی اور کہا کہ اس کی پاکدامنی پر ادنیٰ سے ادنیٰ شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا اور اس کے شوہر کے مرنے کے کوئی دو یا ڈھائی سال بعد بچہ ہوا۔

میرے لیے مرحومہ کی یہ تقریر بالکل نئی اور انوکھی تھی اس لیے یہ مسئلہ میرے حافظے سے بالکل غائب ہو چکا تھا۔ میں نے شرح وقایہ نکال کر دیکھنا شروع کیا۔ اس کے حاشیے پر یہ مسئلہ موجود تھا اور یہ بھی لکھا تھا کہ ضحاک اور عبدالعزیز ماجشونی چار سال بعد پیدا ہوئے تھے۔ اقل مدت حمل چھ ماہ ہے اور اکثر مدت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک دو سال تک ہے۔ لیث بن سعد کے نزدیک تین سال، امام شافعی کے نزدیک چار سال اور زہری کے نزدیک سات سال ہے۔ اس کے بعد میں نے مزید تحقیق شروع کی تو اس نتیجے پر پہنچا کہ فقہا کو زیادہ سے زیادہ مدت کی مثال سات سال کی مل سکی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس سے زیادہ مدت بھی ہو سکتی ہے۔ وہاں کی ایک ہوشیار لیڈی ڈاکٹر ''ہیراوتی'' نے بتایا کہ بارہ سال تک کا سرٹیفکیٹ تو میں دے سکتی ہوں۔ ایک اور صاحب نے بتایا کہ کلکتہ ہائی کورٹ کا ایک فیصلہ بھی بارہ سال کی تائید کرتا ہے۔ واللہ اعلم۔

غرض میں نے اپنا فتویٰ فوراً بدل دیا کہ جب تک کوئی قوی ترین شہادت اس کے خلاف موجود نہ ہو یہ بچہ حلالی ہوگا۔ اور محض اتنی بات کہ شوہر کی وفات کے ڈیڑھ سال یا اس سے زیادہ مدت کے بعد بچہ پیدا ہوا ہرگز اس کے حرامی ہونے کی دلیل نہیں۔ مجھے اس ٹھوکر سے بچانے والی وہ مرحومہ تھیں جو محض اردو زبان ہی کی نہیں بلکہ فقہ کی بھی استانی ثابت ہوئیں۔

علمی ماحول

مرحومہ کو اشعار اس قدر یاد تھے کہ بیسیوں موقعوں پر جب کوئی مصرعہ یا پورا شعر یا کوئی لفظ میں بھول گیا تو میں نے انہیں سے دریافت کیا۔ مرحومہ ایک علمی گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں یعنی ان کی والدہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مرحومہ نواب سید صدیق حسن خاں بھوپال کی نواسی تھیں اور ان کی گودوں میں کھیلی تھیں۔ اور ان کے والد سید احمد شہید کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مرحومہ کی بڑی بہن خود شاعرہ تھیں۔ انور تخلص کرتی تھیں۔ ان کا ایک شعر سن لیجیے۔

آتش عشق ہے کہ دوزخ ہے
فقنا ربنا عذاب النار

مولانا سید سلیمان ندوی نے کئی بار اس شاعرہ مرحومہ کو پیام نکاح بھیجا تھا۔ مگر انہوں نے تجرد کی زندگی میں عمر ختم کر دی۔ اس علمی ماحول میں میری رفیقۂ زندگی نے پرورش پائی اور لکھنؤ کی ٹکسالی زبان تو ان کو ورثے میں ملی تھی۔ وہ میرے اندازے کے مطابق کم از کم تین ہزار کتابیں ختم کر چکی تھیں۔ لیکن وہ اکثر و بیشتر یا تو قرآن اور کچھ وظائف کی کتابیں پڑھتی تھیں یا پھر ادبی کتابیں جاسوسی ناولوں سے انہیں بعایت دل چسپی تھی۔ ہندو مسلمانوں میں کوئی لکھنے والا ایسا نہ تھا جس کے ادبی مضامین اور تصانیف ان کی نظروں سے نہ گذرے ہوں خواہ نظم ہو یا نثر۔ پھر ہر ایک کی لغزش پر آزادانہ تنقید کرتی تھیں۔ وہ بے تکلف یہ بھی بتا دیتی تھیں کہ فلاں کی چوری ہے اور یہ فلاں کی اڑائی ہے۔

محبوبیت

مرحومہ کی محبوبیت کا اندازہ مجھے ان کی وفات کے بعد ہوا۔ بے شمار ایسی عورتوں سے گھر بھر گیا تھا جن کو میں جانتا تک نہ تھا۔ ان کی علالت کے دوران بھی بہت سی عورتیں پابندی سے ان کے پاس آ کر گھنٹوں بیٹھتی تھیں۔ سب سے تعجب مجھے اس وقت ہوا جب پروفیسر سید وقار عظیم کی بیگم نے ایک عجیب بات بیان کی۔ یہ دل کی مریضہ ہیں اور مرگ وغیرہ کا تصور بھی ان کو اختلاج میں مبتلا کرنے کے لیے کافی ہے۔ انہوں نے اپنے شوہر سے بیان کیا کہ: مجھے یہ زندگی میں پہلا گھر ملا ہے جہاں مرگ ہوئی اور مجھے کسی قسم کی وحشت نہ ہوئی۔ لاش کے پاس بہت سی عورتیں دیر شب تک بیٹھی رہیں وہاں سے اٹھنے کو دل نہیں چاہتا تھا اور ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی مرگ نہیں بلکہ شادی وغیرہ کی تقریب ہے۔

ریٹائرڈ تحصیل دار جناب محمود صاحب کی بیگم صاحبہ اور بہت سے لوگ میرے ساتھ نماز عید کے بعد مرحومہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گئے اور اس وقت میں نے دعائے مغفرت کے بعد با آواز بلند یہ دعا کی:

"خداوندا! میں ان سب لوگوں کو گواہ بنا کر اقرار کرتا ہوں کہ مرحومہ نے میرے ساتھ ساری عمر وفا کی ہے اور میں اس کا بھی اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے مرحومہ کے حقوق ادا کرنے میں بڑی بڑی

کوتاہیاں اور زیادتیاں کی ہیں اگر مجھے دس منٹ بھی پہلے یہ خطرہ ہوتا کہ یہ رخصت ہونے والی ہیں تو میں ان کے قدموں سے اپنی آنکھیں مل مل کر اپنی کوتاہیوں اور زیادتیوں کی معافی مانگتا۔ بار الٰہا! تو میری مرحومہ کی روح کو یہ توفیق دے کہ وہ مجھے معاف کر دے"۔

اس کے بعد مجھ سے کچھ بولا نہ جا سکا۔ بیگم محمود میرے پاس روتی ہوئی آئیں اور کہا کہ: میری ایک وصیت کا پورا کرنا تمہارے ذمے ہے اگر میں یہاں تمہاری موجودگی میں مر جاؤں تو میری قبر مرحومہ باجی کے پہلو میں بنوا دینا۔ آپ اس سے اس محبت و عقیدت کا اندازہ کر سکتے ہیں جو بیگم صاحبہ کو مرحومہ کی ذات سے تھی۔

عجیب اجتماع

مرحومہ کے جنازے پر میرے مخلص دوست مولانا وارث کامل بی۔ اے مدیر چٹان موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ: میں نے لاہور کے کسی جنازے میں اتنے مکاتیب خیال کے پڑھے لکھے لوگوں کا اجتماع نہیں دیکھا ہے۔ محترم غلام احمد پرویز، ملک نصر اللہ خاں عزیز، جناب کوثر نیازی، جناب محمد طفیل، مولانا امام خاں، جناب عبادت بریلوی، جناب اثر صہبائی، جناب سید وقار عظیم، جناب پروفیسر ایم ایم شریف (ڈائرکٹر ادارۂ ثقافت اسلامیہ) جناب بشیر احمد ڈار (رفیق ادارہ) مولانا عبدالرحمان طاہر سورتی، جناب عبدالصمد خاں مدیر استقلال وغیرہ جیسے مختلف مکاتیب فکر سے تعلق رکھنے والے حضرات کہاں یک جا ہوتے ہیں؟ شب کو ٹرنک کال ملتے ہی کراچی سے سید اکبر علی قاصد، سید عمادالدین رفاعی اور میری بڑی لڑکی تینوں بذریعہ طیارہ صبح پہنچ کر شریک جنازہ ہوئے میں اپنے بے شمار کرم فرماؤں کو بروقت اطلاع نہیں دے سکا۔ اہل تعزیت کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ان میں قابل ذکر میجر صادق (جو پہلے کیپٹن صادق تھے) بیگم خلیفہ عبدالحکیم، سابق میئر لاہور، میاں امیر الدین، سید نذیر نیازی اور ان کی والدہ وغیرہ ہیں۔

تعزیتی خطوط اور تار کا سلسلہ ابھی تک منقطع نہیں ہوا ہے۔ کلکتہ، پھلواری شریف، لکھنؤ، کانپور، بمبئی، بریلی، کراچی، لائلپور، بہاولپور، سکھر، لاڑکانہ، حیدرآباد، گوجرانوالہ، وزآباد، گورکھپور، جہلم، گوجرہ، ڈھاکہ، میکسیکو، لندن، جدہ اور خدا جانے کہاں کہاں سے بے شمار تعزیت نامے آئے ہیں ان سب کی شکر گزاری کے بعد یہ تاثرات ارسال کر رہا ہوں۔ ان میں تین تاروں کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ نواب سید شمس الحسن (نواب صدیق حسن خان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے پوتے) نے اردو میں تار دیا تھا۔

"دلی صدمہ ہوا۔ سب کو تلقین صبر"

عزیزم حسین عرب نے کراچی سے عربی زبان (انگریزی حروف) میں یہ تار دیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فکبتکم فکبتی. الھمکم اللہ الصبر و السلوی۔ تمہاری مصیبت عین ہماری مصیبت ہے۔ خدا تم سب کو صبر اور تسکین بخشے۔

مولانا غلام حسنین سلیمانی نے پھلواری شریف سے یہ تار دیا جو انگریزی ادب کا شاہکار ہے

(Inna Lillahwords Fail to Condole)

(انا للہ الخ۔ تعزیت کے لیے الفاظ ناکام ہیں)

ہم دونوں عمر کی ایسی منزل سے گزر رہے تھے کہ ایک میں دوسرے کے لیے کوئی صوری کشش نہ تھی۔ میری ۵۸ سال کی اور مرحومہ مجھ سے تقریباً چھ سال چھوٹی۔ مگر یہ نکتہ اسی عمر میں آ کر سمجھا جا سکتا ہے کہ جنسی کشش محض نقطۂ آغاز ہے اور زوجی رابطہ در اصل وہ ہے جسے قرآن نے لتسکنوا الیھا اور جعل بینکم مودۃ و رحمۃ فرمایا ہے۔ اصل رشتہ وہ ہے جس میں سکون، مودت اور رحمت ہے۔ یہ نہ ہو تو زندگی جہنم ہے اور یہ ہو تو جنتی زندگی کا آغاز اسی دنیا سے ہو جاتا ہے۔

موت کی مصلحت

میں نے اور سارے صدمے سہے ہیں، والدین، اولاد، بھائی بہن، دوست احباب وغیرہ کے صدمے دیکھے ہیں لیکن رفیقۂ حیات کے صدمے سے ناواقف تھا۔ اب اس صدمہ کی نوعیت بھی حیطۂ علم و ادراک میں آ گئی۔ سوچتا ہوں کہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو تو پہلے مرنا ہی تھا تو کیا مرحومہ کا پہلے مرنا ہی رحمت و خیر نہیں؟ دل کہتا ہے کہ یہی ٹھیک ہوا۔ خدائے رحیم اپنے بندوں پر اس سے کہیں زیادہ مہربان ہے جتنی مہربان خود مرحومہ اپنی اولاد پر تھیں۔ والدین محض بہانہ ہوتے ہیں ورنہ پرورش تو خدا ہی کرتا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اگر میں پہلے مرتا تو مرحومہ کا کیا حال ہوتا۔ اچھا ہوا جو انہوں نے وہ وقت نہ دیکھا ورنہ وہ پاگل ہو جاتیں۔ یا معلوم نہیں اور کیا ہوتا۔ یہ میں یوں ہی نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ مجھے اس محبت کا اندازہ ہے جو مرحومہ کو اپنے بدقسمت شوہر سے تھی۔ انہوں نے میری خاطر بڑے بڑے پیغامِ نکاح کو صاف رد کر دیا حتیٰ کہ مالدیپ کے مرحوم شہزادے نے پیغام دیا جس کے مقابلے میں میری حیثیت ایک گدا سے زیادہ نہ تھی۔ مگر مرحومہ نے اسے بھی صاف جواب دے دیا۔ میں نے مرحومہ کو کبھی نہ دیکھا تھا نہ ان کو جانتا تھا۔ پھر انہوں نے میرے ساتھ فقر و مسکنت کی زندگی گذارنے کو شاہانہ زندگی پر کیوں ترجیح دی، یہ ایک دلچسپ داستان ہے جو مرحومہ نے ازدواج کے بہت دنوں بعد مجھے خود سنائی۔ ہم اس کا ذکر آگے کریں گے کہنا صرف یہ ہے کہ مرحومہ نے محض مودت و رحمت کے تقاضوں سے مجھے ہر ایک پر ترجیح دی اور یہ رشتہ رحمت و مودت برابر اضافہ پذیر رہا۔ اس لحاظ سے میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ میری موت ان کے

لیے زیادہ ناقابلِ برداشت ہوتی۔ اور ان کا پہلے رخصت ہونا خود ان کے لیے بھی رحمت ہی ہوا۔

میرے احساسات

اس وقت مجھے اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ مرحومہ کہیں ملنے ملانے یا خرید و فروخت کرنے باہر گئی ہوئی ہیں۔ اور بس اب واپس آیا ہی چاہتی ہیں۔ معلوم نہیں کیوں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ مر چکی ہیں۔ اس کے باوجود اندر سے ایک خلا بھی یقینی طور پر محسوس کرتا رہتا ہوں۔ میری ساتوں لڑکیاں مجھ پر جان چھڑکتی ہیں میرے پانچوں داماد مجھے اپنا باپ سمجھتے ہیں اور میری کسی تکلیف کو برداشت نہیں کر سکتے۔ دس نواسے نواسیاں میری زندگی کی رونق ہیں بظاہر کسی چیز کی کمی نہیں مگر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہوں وہ کیسے؟ کسی لمبی تمہید کے بغیر اسے سن لیجیے۔ اب ایسا کوئی نہیں جس سے دل کی بات کہہ سکوں۔

وہ مجھے یاد آتی ہیں اور یاد آتی رہیں گی۔ یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ کب کب یاد آتی ہیں۔ آپ صرف یہ پوچھ سکتے ہیں کہ وہ کون کون ساعت ہوتی ہے جب وہ یاد نہیں آتیں۔ کبھی کبھی تنہائی میں اپنی پوری سینتیس (۳۷) سالہ ازدواجی زندگی ایک فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے گردش کرتی ہوئی آتی ہے۔ اور میں کسی ایک سین میں کھو کر رہ جاتا ہوں۔

ایک خاص بات اور بھی سن لیجیے۔ بے عیب ذات صرف خدا کی ہے مرحومہ میں ہماری طرح بہت سی کمزوریاں بھی تھیں جن پر میں انہیں ٹوکا اور جھڑکا بھی کرتا تھا لیکن آج قسم لے لیجیے، مجھے جب بھی وہ یاد آتی ہے تو اپنی بے شمار خوبیوں کے ساتھ یاد آتی ہے ان کا کوئی نقص ذہن میں نہیں آتا۔ اب وہ ہر آن ایک معصوم مجسم کی شکل میں میرے سامنے آتی ہیں جس سے میں ایک ہی نتیجہ نکالتا ہوں کہ مرحومہ میں خوبیاں بہت زیادہ غالب تھیں اور میں زندگی میں جس قسم کی خردہ گیریاں کرتا تھا ان کی کوئی خاص حیثیت نہ تھی۔

ایک اور خلا

عام باپوں کی طرح میں بھی اپنی اولاد کو ڈانٹ پھٹکار کیا کرتا ہوں لیکن جس اولاد کی شادی ہو جائے میں اسے کچھ نہیں کہتا۔ محض احتراماً ایسا نہیں کرتا بلکہ یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ اب میرا اس پر زیادہ حق و اختیار نہیں اور ایک خیال یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر اس نے برابر سے جواب دے دیا تو میں شاید آپے سے باہر ہو کر اس سے قطع تعلق کر لوں گا لیکن بیوی میری خفگی کو برداشت بھی کرتی تھی اور بعض اوقات میری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اینٹ کا جواب پتھر سے بھی دیتی تھی اس کے باوجود جس طرح وہ میری اینٹ کو برداشت کر لیتی تھی اسی طرح میں اس کے پتھر کو پی جاتا تھا۔ آج میں اپنے اندر عجیب سا خلا پا رہا ہوں کہ اب دنیا میں ایسا کوئی موجود نہیں جو میری خفگی کو برداشت کرے اور اسی طرح میں اس کی خفگی کو پی جاؤں۔

رومان نہیں رحمت

اچھا آیئے ذرا وہ داستان بھی سنیے کہ مرحومہ نے مجھ جیسے گدائے بے نوا کو شہزادوں پر کیوں ترجیح دی تھی؟ غالباً ۱۱ یا ۱۲ء کا ذکر ہے کہ میں اپنے والد ماجد (حضرت قبلہ مولانا شاہ سلیمان پھلواری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) کے ساتھ لکھنؤ گیا۔ نواب سید نور الحسن خاں (نواب سید صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے بڑے صاحبزادے) کے ہاں قیام ہوا۔ کیونکہ دونوں ہم مرشد یعنی حضرت مولانا فضل الرحمان گنج مرادآبادی کے مسترشد تھے اور دونوں میں بڑے گہرے مراسم تھے۔ میری عمر اس وقت نو دس سال کی تھی۔ میں "لطیم" تھا۔ یعنی میں ابھی شیر خوار ہی تھا کہ میری ماں دنیا سے رخصت ہو چکی تھیں۔ نواب صاحب مرحوم میری بڑی ناز برداری کرتے تھے میری فرمائش پر گراموفون ریکارڈ نکال کر سنایا کرتے تھے۔ اور خود مجھ سے گانے سنا کرتے تھے۔ میں بے تکلف زنانے مکانوں میں دوسرے بچوں کی طرح آ جاتا تھا۔ پاس ہی نواب صاحب کی بھانجی (نواب اشرف جہاں بیگم) کی کوٹھی تھی۔ ایک دن میں اپنا کوئی پھٹا کپڑا لے کر وہاں سلوانے کی غرض سے اندر گیا۔ اسی گھر میں چار پانچ سال کی ایک بچی تھی۔ اسے معلوم ہوا کہ یہ لڑکا جو اپنا پھٹا کپڑا سلوانے آیا ہے بے ماں کا بچہ ہے۔ اس وقت اس نے مجھے بڑی رحمت بھری نظروں سے دیکھا اور دل میں یوں ہی ایک آرزو پیدا ہوئی کہ اس بے ماں کے بچے سے میری شادی ہو جائے تو میں اس کے کپڑے سی دیا کروں گی۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ میں اپنے وطن پھلواری شریف چلا آیا۔ اس کے بعد نواب سید نور الحسن خاں صاحب کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے ہمارے گھرے اور بھوپال ہاؤس سے ایک بے تعلقی سی ہو گئی۔ ۱۹۱۹ء میں ترک موالات کی تحریک اپنے شباب پر آئی۔ انگریزی تعلیم چھوڑنے کی تحریک نے زور پکڑا۔ میں نے دسویں سے اور میرے بھائی مولانا شاہ غلام حسنین مدظلہ نے بی اے سے اسٹرائک کی اور چند دنوں کے بعد ندوۃ العلماء لکھنؤ میں عربی تعلیم کے لیے آ گئے۔ اس دوران حضرت قبلہ والد ماجد بھی چند بار لکھنؤ تشریف لائے اور بھوپال ہاؤس ہی میں قیام فرما ہوئے اور برسوں کے ٹوٹے ہوئے تعلقات پھر سے جڑ گئے۔ ہم دونوں بھائی بھی عموماً یہاں آیا کرتے تھے۔ یہاں مجھ سے اکثر مثنوی اور ایسی چیزیں ترنم کے ساتھ پڑھنے کی فرمائش ہوتی۔ کسی دن میرے گانے کی آواز وہاں بھی گئی جہاں میں کبھی اپنی طفلی میں اپنا پھٹا ہوا کپڑا سلوانے گیا تھا۔ جس معصوم بچی نے مجھے لطیم کی حیثیت کی

© rasailojaraid.com

نگاہوں سے دیکھا تھا۔ وہ جوان ہو چکی تھی۔ بھولی ہوئی یاد نے چٹکی لی اور اس نے میری آواز سن کر اپنی ذہانت اور حافظے سے بھانپ لیا کہ یہ وہی شخص ہے جس کی لطیمی پر مجھے کبھی ترس آیا تھا۔ اور اس کے پھٹے کپڑے سینے کی معصوم تمنا دل میں پیدا ہوئی تھی۔ اللہ اللہ کتنی پاکیزہ اور معصوم آرزو سے آغاز ہوا تھا۔ اور آغاز کس انجام کی طرف لیے جا رہا تھا۔ یہ کوئی رومان نہ تھا صرف رحمت کے تقاضے سے تھے۔ جو اپنی تکمیل چاہتے تھے۔ اسی آرزو نے استقامت اختیار کر لی۔ پانچ سال کے بعد میں ندوۃ العلماء سے فارغ التحصیل ہو کر نکلا۔ اس درمیان میں اچھے سے اچھے پیغام آئے لیکن وہ خدا کی بندی اپنی معصوم و پاکیزہ آرزو پر چٹان کی طرح جمی رہی۔

یہ ہے وہ مختصر سی داستان جو مرحومہ نے مجھ سے خود بیان کی۔ یہی تھی وہ بات جس کی وجہ سے مرحومہ نے ایک گدائے بے نوا کے ساتھ فقیرانہ زندگی گزارنے کو شاہانہ زندگی پر ترجیح دی۔ انقلاب زمانہ دیکھیے وہ میرے کپڑے سینے کی آرزو لے کر آئی تھی اور ۲۶ مارچ ۲۰۰۶ء کو میں اس کا آخری لباس سلوا رہا تھا۔ اسے میری لطیمی پر ترس آیا تھا اور اب خود اس کا فرزند لطیم ہے۔

تلک الایام نداولہا بین الناس.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خدا، رسول اور قیامت کے متعلق سرسید کے عقائد

(اخبار "صدق جدید" لکھنؤ بابت ۷، اکتوبر ۱۹۶۰ء)

لندن سے واپس آنے کے بعد جب سرسید نے اپنا اصلاحی کام شروع کیا اور قوم کی زبوں اور ابتر حالت کو بہتر بنانے کا ارادہ کیا اور علی گڑھ میں، مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ایک مدرسے کے قیام کا اعلان کیا تو قوم نے اس مفید کام میں ان کی مدد کرنے کی بجائے ہر طرف سے ان پر نہایت زور شور کے ساتھ کفر کے فتوؤں کی بارش ہونے لگی اور مکہ معظمہ تک سے سرسید کے کفر کے فتوے منگوائے گئے۔ غریب سید کو کافر، ملحد، بے دین بنانے والے علمائے کرام نے سارے ہندوستان کا دورہ کیا اور نہایت کوشش سے ہر جگہ کے مشہور علماء سے سرسید کے کفر پر مہریں لگوائیں۔ اسی سلسلے میں مونتین حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی مدرسہ دیوبند کے پاس بھی پہنچے اور ان سے درخواست کی کہ آپ بھی سرسید کے کفر کی تصدیق فرما دیجیے تاکہ کسی مسلمان کو اسے کافر سمجھنے میں کوئی شک وشبہ نہ رہے۔ اس زمانہ میں کفر کے فتووں میں یہ فقرہ لازمی ہوتی تھی کہ جس شخص کے متعلق کفر کا فتویٰ دیا جارہا ہے۔ جو شخص اسے کافر نہ سمجھے وہ بھی کافر ہے اور اس کی بیوی پر طلاق ہے۔ غرض جب علمائے کرام نے اس یقین واعتماد کے ساتھ سرسید کے کفر کا فتویٰ حضرت مولانا محمد قاسم خدمت میں پیش کیا کہ حضرت مولانا بلاچون وچرا اور بلاتامل اس فتوے پر مہر تصدیق ثبت فرمادیں گے۔ کیوں کہ اس وقت یہ متفق علیہ مسئلہ تھا کہ:

سید احمد خاں کو کافر جاننا اسلام ہے

لیکن علمائے کرام کی حیرت کی انتہا نہ رہی اور ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا جب ان کی توقع اور امید کے بالکل برخلاف حضرت مولانا نے نہایت سنجیدگی سے فرمایا کہ ٹھہریے! پہلے میں ذاتی طور پر اس امر کی تحقیق تو کرلوں کہ سید احمد واقعی کافر ہے؟ یا لوگوں نے اسے "کافر" بنادیا ہے؟

اس گفتگو کے بعد حضرت مولانا نے حسب ذیل سوالات لکھ کر سرسید کو بھیجے اور ان کو لکھا کہ ان کے مختصر جوابات لکھ کر بھیج دیں۔ یہ سوال اور ان کے جوابات ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

(۱) سوال: خدا کی بابت آپ کا جو عقیدہ ہے وہ بہت مختصر طور پر چند لفظوں میں لکھ دیں۔

جواب: خدا تعالیٰ ازلی، ابدی، مالک اور صانع تمام کائنات کا ہے۔

(۲) سوال: حضرت نبی کریم محمد ﷺ کے متعلق آپ کیا اعتقاد رکھتے ہیں؟

جواب: بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔

(۳) سوال: قیامت کی بابت آپ کے خیالات کیا ہیں؟

جواب: قیامت برحق ہے۔

سرسید کی طرف سے ہر سہ امور کے متعلق یہ جواب موصول ہونے پر حضرت مولانا نے علمائے کرام سے فرمایا ہے کہ: "کیا تم ایسے شخص کے کفر پر مجھ سے دستخط کرانا چاہتے ہو جو پکا مسلمان ہے؟ جاؤ میں قیامت تک اس فتوے پر دستخط نہیں کروں گا"۔

(بحوالہ۔ مقالات سرسید، مرتبہ مولانا محمد اسمٰعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور۔ ص ۵۱۔۵۳)

....

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تفسیر المسائل و الاحکام

ڈاکٹر حافظ محمد شکیل اوج

مذہبی اجتماعات میں خواتین کی شرکت

سوال: معزز زین علاقہ مساجد میں نماز جمعہ، تراویح، عیدین اور دیگر تقریبات میں اصلاح احوال اور تربیت کے لیئے شرعی حدود کی پاسداری اور پردے کے مناسب اہتمام کے ساتھ خواتین کی شرکت کے خواہاں ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ دریں سلسلہ قرآن وسنت کی روشنی میں ہماری رہنمائی فرمائیں۔

(ڈاکٹر محمد نصر اللہ، گلشن حدید، فیز ۔ نو، کراچی)

جواب: قرآن مجید کا مخاطب مرد بھی ہے اور عورت بھی۔ اور دونوں اپنی اپنی جگہ اللہ کی بارگاہ میں تنہا مسئول بھی:

ولقد جئتمونا فرادیٰ۔۔۔۔۔(الانعام/۹۴)

اور تم ہمارے پاس (جواب دہی کے لیئے) اکیلے اکیلے آؤ گے۔

زمانۂ نزول قرآن میں، جو دین قائم کیا جا رہا تھا، اس میں عبادت اور تربیت کے پہلو سے مرد و عورت میں کوئی خاص تفریق نہیں تھی۔ مسجدوں میں مردوں کے ساتھ، بچوں اور عورتوں کی صفیں ہوا کرتی تھیں۔ اس فرق کے ساتھ ابتدائی صفیں مردوں کے لیئے درمیانی بچوں اور آخری صفیں عورتوں کے لیئے تھیں۔ بس اتنا ہی فرق تھا۔ یہ نہیں تھا کہ عورتوں کو مسجد میں آنے سے روک دیا جاتا ہو۔ اور گھروں میں بیٹھے رہنے پر اصرار کیا جاتا ہو، اگر ایسا ہوتا تو دین صرف مردوں کا ہوتا۔ عورتوں کا کوئی دین نہ ہوتا۔

مسجدیں اپنی اصل میں شروع سے ہی عبادت کے ساتھ ساتھ تعلیم و تربیت اور تہذیب نفس کا مرکز رہی ہیں۔ اور تہذیب و تربیت کی ضرورت مرد و عورت دونوں کو یکساں ہوتی ہے۔ اگر ان میں سے کسی بھی ایک فریق کو تعلیم و تربیت کے لئے مخصوص کر لیا جائے اور دوسرے سے غفلت برتی جائے تو نتیجہ فکری اختلاف اور عملی انتشار کے سوا کچھ اور نہیں نکلے گا۔ عورتوں کا اپنا الگ دین دھرم ہوگا اور مردوں کا اپنا۔ اور دونوں میں بعد المشرقین۔ اس لیئے کہ دونوں کی تعلیم و تربیت الگ الگ راستوں سے ہو رہی ہوگی۔ ہاں اگر ان کا مرکز عبادات و تہذیب اور محور تعلیم و تربیت یکساں کر لیا جائے تو ہم فکری و ہم خیالی کی صورت میں مثبت رویے پروان چڑھیں گے اس لیئے اسلام نے عورتوں کو مسجدوں میں آنے سے بالکل نہیں روکا۔ بلکہ

عیدین کی نمازوں کے لئے تو رسول اللہ ﷺ نے خواتین کو عیدگاہوں میں آنے کی خصوصی تاکید کی تھی۔ حالانکہ بعض خواتین نے اپنی اذیت ماہانہ کا عذر شرعی بھی بتایا تھا مگر اس پر بھی رسول اللہ ﷺ نے انہیں آنے کا پابند کیا اور فرمایا بے شک تم نماز نہ پڑھو مگر ایک طرف بیٹھی رہو۔ (صحیح البخاری، کتاب العیدین)

اس لیئے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ فی زمانہ جہاں خواتین زندگی کے تمام میدانوں میں مردوں کی طرح کام کر رہی ہیں وہیں عبادت و تربیت کے میدان میں بھی انہیں شرعی حدود کی پابندی کے ساتھ عبادت کرنے اور علم سیکھنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ عام نمازوں میں تو شاید ضرورت اس امر کی استقدر داعی نہ ہو تاہم نماز جمعہ، تراویح اور عیدین میں اور اسی طرح کے دیگر مفید علمی و فکری اجتماعات میں خواتین کو شریک کیا جاسکتا ہے۔ تاکہ معاشرہ میں ہم آہنگی کی فضا قائم ہو سکے۔ اور دین کے سرچشموں سے دونوں فریق اپنی اپنی حیثیت اور بساط کے مطابق ایک ہی وقت میں یکساں مستفید ہو سکیں۔

قرآن مجید نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایکدوسرے کا اولیا قرار دیا ہے:

والمومنون والمومنات بعضهم اولياء بعض۔ (التوبہ/۷۱)

اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایکدوسرے کے اولیاء ہیں۔

اس ولایت کی رو سے مومنوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ہمیشہ دوست، مددگار اور ہم نوا بنکر رہیں۔ اور یہ تبھی ممکن ہے کہ جب انکی منزل مقصود اور اسکے حصول کے لیئے ان کے راستے یکساں ہوں، مقام اجتماع بھی ایک ہو اور مورد علمی بھی ایک ہو۔ اس دوستی، مددگاری اور ہمنوائی کی عملی شکل یہ ہونی چاہیے کہ غلط جگہوں پر خواتین اپنے محرموں کے ساتھ شریک مجلس ہوں۔ بایں صورت منفی اثرات و دیگر خطرات پیدا ہونے کی امکانی صورتیں مسدود رہیں گی اور صالحیت نمو پذیر ہوگی اور ہر دو فریق میں باہمی اعتماد کی فضا بھی قائم رہیگی، بالخصوص خواتین میں اعتماد زیادہ بڑھے گا جو انکی آئندہ کی زندگی میں متعدد پہلوؤں سے مددگار ثابت ہوگا۔

مسجدوں میں خواتین کی آمد کو یقینی بنانے کے لیئے درج ذیل اقدامات کرنے کی ضرورت ہے:

۱۔ مسجدوں میں آمدورفت کے دروازے الگ الگ بنا دیے جائیں۔

۲۔ یک منزلہ مسجدوں میں خواتین دور رسالت مآب ﷺ کی طرح پچھلی صفوں میں اپنی جگہ بنائیں۔

۳۔ دو یا تین منزلہ مسجدوں میں کوئی ایک منزل خواتین کے لیئے وقف کر دی جائے۔

۴۔ کھلے میدانوں اور عیدگاہوں میں خواتین کا پورشن (Portion) مردوں سے الگ بنایا جائے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۵۔ خواتین سادہ ملبوس میں میک اپ اور خوشبو کے بغیر حاضر ہوں۔

اس طرح شرعی حدود کا لحاظ و پاس بھی رہے گا اور پردے کا مناسب انتظام بھی ہو جائے گا۔

اب ذیل میں وہ احادیث ملاحظہ ہوں۔ جن میں ہمارے موقف کی تائید بڑی وضاحت کے ساتھ نظر آتی ہے۔

صحیح مسلم کی روایت ہے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی شخص کی عورت مسجد میں جانے کی اجازت مانگے تو اسے منع نہ کرو۔ (رقم الحدیث ۸۹۱)

صحیح مسلم کی ہی ایک اور روایت ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زوجہ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ہم سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی عورت مسجد میں جائے تو خوشبو نہ لگائے۔ (رقم الحدیث ۹۰۰)

صحیح بخاری کی روایت ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب تمہاری عورتیں رات کو مسجد میں جانے کی اجازت مانگیں تو انہیں اجازت دے دو۔ (صحیح بخاری، جلد اول، ص ۱۱۹، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع۔ کراچی ۱۳۸۱ھ)

امام بزار اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ حضرت زید بن خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی بندیوں کو مسجدوں میں آنے سے مت روکو، تاہم انہیں چاہیئے کہ وہ بغیر خوشبو کے آئیں۔ (حافظ نور الدین بن علی بن ابی بکر الہیثمی (متوفی ۸۰۷ھ) کشف الاستار جلد اول ص ۲۲۲)

حلیم۔۔۔ اللہ کا صفاتی نام یا ایک طعام؟

سوال: بعض لوگ محرم میں ایک خاص پکوان پکاتے ہیں۔ جسے کھچڑا یا حلیم کہتے ہیں۔ حلیم تو اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔ پھر یہ پکوان کا نام کیوں؟ (محمد زین اقبال، کراچی)

جواب: بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے بیشمار صفاتی اسماء میں ایک اسم حلیم بھی ہے۔ اور وہ بھی اسی طرح تقدس، عظمت، بزرگی اور برکت کا حامل ہے۔ جس طرح اس کے دیگر اسماء۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ لوگوں نے اپنے ایک طعام کا نام اس اسم صفت پر رکھا ہوا ہے۔ جو کسی طرح بھی مناسب نہیں۔

ہاں بیٹے! اگر اچھا آدمی مرے تو وہ جنت میں جاتا ہے

پھر تو مر جانا اچھی ہی بات ہے

اور کیا

قبر میں آدمی سڑ گل جاتا ہے نا؟

ہاں سڑ گل جاتا ہے۔

تو پھر جنت میں کیا چیز جائے گی؟

یہ جسم تو فقط لباس ہے۔ آدمی کی روح یہ لباس چھوڑ کر دوسرا لباس پہن لیتی ہے اور جنت میں چلی جاتی ہے۔

میری یہ بات شاید پوری طرح اس کی سمجھ میں نہ آسکی مگر وہ خاموش ہو گیا اور سوچنے لگا۔ یہ گفتگو اس وقت ہوئی جب مرحومہ ابھی میو اسپتال میں تھیں۔

ماں کے انتقال کے بعد لوگوں کو روتا ہوا دیکھ کر مجھ سے پوچھا کہ یہ لوگ رو کیوں رہے ہیں؟ میں نے متوازن لہجے میں الگ لے جا کر بتایا کہ تمہاری باجی (مرحومہ کو ان کی ساری اولاد اور ان کے سب ملنے والے باجی کہا کرتے تھے) کا انتقال ہو گیا ہے نا۔ لوگ خواہ مخواہ رو رہے ہیں۔ یہ سن کر وہ ذرا رو دیا۔ میں نے اسے سمجھایا تو وہ ایک منٹ خاموش ہو گیا۔ اور مجھ سے ایک دلخراش سوال کیا کہ پھر اب میری ماں کون بنے گا؟ میں نے کہا میں تمہارا باپ بھی ہوں اور ماں بھی۔ اس کے علاوہ تمہاری تو بہت سی مائیں ہیں۔ تمہاری سب بہنیں بھی تو تمہاری مائیں ہی ہیں۔ اس کے بعد وہ مطمئن ہو گیا۔ اور اپنے عام مشاغل میں لگ گیا تھوڑی دیر کے بعد بہت سی عورتیں اور مرد جمع ہو گئے تو اس نے کہا۔

یہ لوگ رو کیوں رہے ہیں؟ باجی کو کتنی تکلیف تھی۔ اس سے نجات مل گئی۔ اس سڑی بُسی دنیا سے وہ چلی گئیں۔ اب وہ بہت اچھی دنیا میں جا کر رہیں گی اس میں رونے کی کیا بات ہے؟

اس کے بالکل یہی الفاظ تھے جو میں نے نقل کیے ہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس بچے کے اندر کسی اچھے فلسفی مومن کی روح بول رہی ہے وہ کھانا کھا کر سو گیا۔ صبح وہ خوش و خرم دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلتا رہا۔ دن کے سوا بارہ بجے جنازہ اٹھنے لگا تو اس نے کہا کہ میں بھی ساتھ چلوں گا کیونکہ میں نے آج تک کوئی قبر نہیں دیکھی ہے۔ وہ جنازے کے ساتھ ساتھ قبرستان تک گیا۔ سب کے ساتھ نماز جنازہ ادا کی۔ دفن تک وہ ادھر ادھر مختلف قبروں کو دیکھتا رہا۔ سب مٹی ڈال چکے تو وہ بھی آیا اور اپنے چھوٹے [illegible] مٹی ڈالی۔ پھر اپنے نازک ہاتھوں سے پھولوں کی چادر کا ایک کونہ پکڑ کر چادر لگا رکھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ہم سب کے ساتھ ہنستا کھیلتا گھر واپس آ گیا۔

عید کے دوسرے یا تیسرے دن وہ باصرار میرے ساتھ اپنی باجی کی قبر پر پھول چڑھانے گیا کچھ اور لوگ بھی تھے۔ اس وقت اس معصوم بچے نے مجھ سے پوچھا۔

اب اس قبر میں باجی پڑی ہوں گی؟

وہ یہاں کہاں؟ وہ تو جنت میں چلی گئیں۔

تو پھر اس میں کوئی چیز نہیں؟

قبر میں اب کیا رکھا ہے؟ اس کے بعد اس نے ایک عجیب سوال کیا

جب آدمی کو مرنا ہی ہے تو وہ پیدا کیوں ہوتا ہے؟

اللہ میاں اس لیے پیدا کرتے ہیں کہ دیکھیں آدمی اچھے کام کرتا ہے یا برے اگر اچھے کام کرے تو مرنے کے بعد جنت میں جاتا ہے اور برے کام کرے تو جہنم میں ڈال دیا جاتا ہے یہ قبر تو صرف ایک دروازہ ہے اس دروازے سے اچھے لوگ جنت میں جاتے اور برے جہنم میں پہنچ جاتے ہیں۔

غرض مجھ پر بھی عجیب نزول سکینہ تھا اور میرے فرزند پر تو اس سے بھی زیادہ نزول سکینہ آج تک ہے۔ اور میرے خیال میں صوفی صاحب کے خواب کی یہی تعبیر ہے۔

نتیجہ

اس داستان خواب کو بیان کرنے سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ نہ خوابوں پر زیادہ اعتماد کرنا چاہیے اور نہ خوابوں کی تعبیر پر۔ نہ ہر خواب کی تعبیر ضروری ہے اور نہ ہر تعبیر کا درست ہونا لازمی ہے۔ خواب اور اس کی تعبیر بالکل بے حقیقت چیز بھی نہیں لیکن اس پر زیادہ اعتماد کرنے سے بہت سی ذہنی اور عملی کمزوریاں پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ خواب و خیال کی دنیا میں جتنا زیادہ انہماک ہوگا۔ اتنا ہی دنیائے بیداری کے کارخانے میں خلاء پیدا ہو جائے گا۔ بلاشبہ دنیا امیدوں پر قائم ہے۔ لیکن موہوم توقعات میں کھو جانا بھی صحیح نہیں۔

تقریباً یہی حال کشوف کا بھی ہے۔ کشف وغیرہ پر بھی زیادہ اعتماد درست نہیں بعض اوقات تو خود صاحب کشف کشف کا مطلب نہیں سمجھتا اور بعض اوقات اس میں ایسا ابہام سا ہوتا ہے کہ اس میں کئی پہلو نکلتے ہیں۔ اور سننے والا اس سے جو مطلب اخذ کرتا ہے وہ غلط ثابت ہوتا ہے۔

یہ ہے وہ سبق جو مرحومہ کی موت مجھے دی گئی ہے۔ میں اسے اپنے تصور کو عام کرنے کی غرض سے شائع کر رہا ہوں۔ کوئی یوسف وقت ہو یا ابن سیرین جیسا تعبیر خواب کا ملکہ رکھتا ہو تو بے شک اس کی

تعبیروں پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ خوابوں یا اس کی سرسری تعبیروں پر بیداری کی زندگی کا دارومدار نہیں رکھنا چاہیے۔

ناقابل تلافی نقصان

مرحومہ کی وفات سے میرا جو ناقابل تلافی نقصان ہوا وہ علمی و ادبی نقصان ہے۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ سن لیجیے۔ ایک بار مرحوم ڈاکٹر عبدالحکیم نے مجھ سے کہا: بعض الفاظ ہم لوگوں کی زبان پر ایسے بھی جاری ہیں جن کے صحیح مفہوم سے ہم لوگ آشنا نہیں۔ بتایئے ہم "حلوہ مانڈہ" بولا کرتے ہیں۔ مانڈے کا کیا مطلب ہے؟ میں نے کہا کل بتاؤں گا۔ دوسرے دن انہیں بتایا کہ حلوے کے ساتھ جو بڑے بڑے پراٹھے ہوتے ہیں۔ انہیں "مانڈا" کہتے ہیں۔ پوچھا۔ یہ کس لغت میں دیکھا ہے؟ میں نے کہا۔ "زوج اللغات" میں۔ پوچھا یہ کونسا لغت ہے؟ میں نے کہا یہ صرف میرے پاس ہے یہ کوئی کتاب نہیں بلکہ میری زوجہ محترمہ ہے۔ جس محاورے، روزمرہ، ضرب الامثال، کہاوت، الفاظ، تذکیر و تانیث وغیرہ کا مجھے علم نہیں ہوتا یا مجھے شک رہتا ہے اسے میں اسی زوج اللغات سے دریافت کر لیتا ہوں۔ اردو زبان میں میری استانی وہی ہیں۔ مرحوم خلیفہ صاحب نے اس پر ایک فرمائشی قہقہ لگایا۔ اس کے بعد بھی انہوں نے کئی موقعوں پر مجھ سے بعض باتیں دریافت کیں۔ مرحوم کی کتاب "فکر اقبال" پر ایک اخبار (ہماری زبان کراچی) نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس میں خلیفہ صاحب نے "عار" کو مذکر لکھا ہے حالانکہ یہ مؤنث ہے۔ خلیفہ صاحب نے ہم لوگوں سے دریافت کیا۔ مولانا رئیس احمد جعفری نے کہا کہ عار مذکر ہے۔ میں نے کہا میرے کان اس کی تانیث سے آشنا ہیں۔ مزید تصدیق زوج اللغات سے کی جائے گی۔ دوسرے دن "زوج اللغات" نے میری رائے کی تائید کی اور اتفاق سے اسی دن "جامع اللغات" سے بھی اس کی تصدیق ہو گئی۔

میں جب کپور تھلے (مشرقی پنجاب) میں تھا تو جناب خواجہ حسن نظامی نے میرے پاس ایک کتاب بھیجی کہ اس کتاب کی تصحیح کر کے اس کی زبان کو سہل بنا دیا جائے۔ اس میں بلا مبالغہ پچاسوں محاورات، ضرب الامثال اور کہاوتیں ایسی تھیں جن سے میں بالکل ناواقف تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دو چار مقامات کے سوا سارے مقامات مرحومہ ہی نے حل کیے تھے۔ ایک بار مولانا تمنا عمادی نے مجھے اپنی ایک غزل سنائی جس میں ایک مصرعہ یوں تھا

سایہ پڑا پڑا جب جو سرو ہو گیا

میں نے عرض کیا کہ مضمون کے متعلق تو کچھ عرض کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا لیکن ایک لفظ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کھلتا ہے۔ پڑا پڑا صحیح نہیں۔ کہنے لگے تم کوئی سند نہیں ہو۔ اندر جا کر دریافت کرو۔ میں نے جا کر اپنی زوج اللغات سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ پڑے پڑے ہونا چاہیے اس کے بعد مولانا ممدوح نے بھی تصحیح فرمالی۔

مجھے یاد ہے کہ کئی موقعوں پر میں نے مرحومہ سے کہا کہ فلاں لفظ جو تم بولتی ہو صحیح نہیں کیونکہ یہ فلاں قاعدے کے خلاف ہے۔ اس کا جواب انہوں نے ہمیشہ یہی دیا کہ قاعدہ و قانون آپ اپنے پاس رکھیے۔ یہ لفظ اس لیے صحیح ہے کہ میں یوں ہی بولتی ہوں۔ میری زبان قاعدے قانون سے نہیں بنی ہے۔ بلکہ قاعدے قانون میری زبان سے بنے ہیں۔ یہاں آ کر میرے پاس لاجوابی کے سوا اور کوئی جواب نہیں ہوتا تھا۔ میں نے انکی کئی باتوں کو تسلیم نہیں کیا۔ اس کے باوجود ماہنامہ مہر نیمروز (کراچی) کی اس بات سے اتفاق ہے کہ مرحومہ کو اردو زبان میں درجۂ استناد حاصل تھا۔

ادبی لطیفے

مرحومہ کے بعض ادبی لطیفے بھی خوب ہوتے تھے۔ ایک بار وہ کوئی مسہلی دوا پکا رہی تھیں میں نے کہا اس میں نیم کی پتیاں بھی شامل کرلو۔ کہنے لگیں کیا آپ کہاں سے نیم حکیم بن کر ٹپک پڑے؟

ایک بار لکھنو میں ڈاکٹر عبدالعلی صاحب (ناظم ندوۃ العلماء) نے انہیں بتایا کہ بکری کا کچا دل پیس کر پی لیا کرو۔ مرحومہ نے برجستہ کہا۔ اس سے تو بزدل بن جانے کا بھی خطرہ ہے۔

مولانا عزیز الدین ندوی کی شادی شرف النساء سے ہوئی۔ مرحومہ نے مجھ سے کہا کہ میں ایک رومال کاڑھ رہی ہوں وہ انہیں میری طرف سے تحفے میں دے دیجیے گا۔ اس میں میں صرف ایک مصرعہ کاڑھنا چاہتی ہوں۔ میں نے پوچھا کون سا مصرعہ؟ کہنے لگیں: "گر قبول افتد زہے عز و شرف"۔ میں مصرعے کے اس انتخاب پر پھڑک اٹھا۔

لائل پور کے ہفت روزہ "المنبر" نے مرحومہ کی تعزیت کرتے ہوئے صحیح لکھا تھا کہ ۔۔۔ محمد جعفر کی ساری زندہ دلی اور شگفتگی مرحومہ ہی کے دم سے قائم تھی۔

فتوے کی اصلاح

سب سے زیادہ تعجب مجھے اس وقت ہوا جب مرحومہ نے میرے ایک فتوے کی اصلاح کی۔ وہیں کپور تھلے میں ایک بیوہ عورت کے (شوہر مرنے کے ڈیڑھ سال بعد) بچہ پیدا ہوا۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ حلالی ہے یا حرامی؟ میں نے اسکینے پر لکھ دیا کہ حرامی ہے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ عورتوں کا معاملہ ہے ذرا

اپنی بیوی سے بھی پوچھ لوں۔ مرحومہ نے کہا آپ کا فتویٰ بالکل غلط ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ شوہر کے مرنے کے ڈیڑھ سال بعد جو بچہ پیدا ہو وہ لازماً حرامی ہو۔ ہوتا یہ ہے کہ بعض اوقات رونے دھونے یا ہاتھ پاؤں بیٹھنے سے خون جاری ہو جاتا ہے اور بچے کی پرورش نہیں ہو پاتی لیکن وہ تخم محفوظ رہتا ہے اور جب خون بند ہو کر اسے غذا ملنے لگتی ہے تو اس کی پرورش شروع ہو جاتی ہے اور وہ بالکل حلالی بچہ ہوتا ہے۔ جو بہت دنوں کے بعد وجود میں آجاتا ہے۔ پھر کہا: یوں حرامی ہونے کا امکان تو اس وقت بھی ہے جب کہ شوہر زندہ ہو لیکن شوہر کی وفات کے بہت دنوں کے بعد پیدا ہونا حرامی ہونے کی دلیل بالکل نہیں۔ اس کے بعد مرحومہ نے کئی مثالیں دیں۔ ایک مثال خود اپنے گھر کی ایک خادمہ (امینہ) کی دی اور کہا کہ اس کی پاکدامنی پر ادنیٰ سے ادنیٰ شبہ بھی نہیں کیا جاسکتا اور اس کے شوہر کے مرنے کے کوئی دو یا ڈھائی سال بعد بچہ ہوا۔

میرے لیے مرحومہ کی یہ تقریر بالکل نئی اور انوکھی تھی کیونکہ یہ مسئلہ میرے حافظے سے بالکل غائب ہو چکا تھا۔ میں نے شرح وقایہ نکال کر دیکھنا شروع کیا۔ اس کے حاشیے پر یہ مسئلہ موجود تھا اور یہ بھی لکھا تھا کہ ضحاک اور عبدالعزیز ماجشونی چار سال بعد پیدا ہوئے تھے۔ اقل مدت حمل چھ ماہ ہے اور اکثر مدت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک دو سال تک ہے۔ لیث بن سعد کے نزدیک تین سال، امام شافعی کے نزدیک چار سال اور زہری کے نزدیک سات سال ہے۔ اس کے بعد میں نے مزید تحقیق شروع کی تو اس نتیجے پر پہنچا کہ فقہا کو زیادہ سے زیادہ مدت کی مثال سات سال کی مل سکی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس سے زیادہ مدت بھی ہو سکتی ہے۔ وہاں کی ایک ہوشیار لیڈی ڈاکٹر "ہیراوتی" نے بتایا کہ بارہ سال تک کا سرٹیفکیٹ تو میں دے سکتی ہوں۔ ایک اور صاحب نے بتایا کہ کلکتہ ہائی کورٹ کا ایک فیصلہ بھی بارہ سال کی تائید کرتا ہے۔ واللہ اعلم۔

غرض میں نے اپنا فتویٰ فوراً بدل دیا کہ جب تک کوئی قوی ترین شہادت اس کے خلاف موجود نہ ہو یہ بچہ حلالی ہوگا۔ اور محض اتنی بات کہ شوہر کی وفات کے ڈیڑھ سال یا اس سے زیادہ مدت کے بعد بچہ پیدا ہوا ہرگز اس کے حرامی ہونے کی دلیل نہیں۔ مجھے اس ٹھوکر سے بچانے والی وہ مرحومہ تھیں جو محض اردو زبان ہی کی نہیں بلکہ فقہ کی بھی استانی ثابت ہوئی۔

علمی ماحول

مرحومہ کو اشعار اس قدر یاد تھے کہ بیسیوں موقعوں پر جب کوئی مصرعہ یا پورا شعر یا کوئی لفظ میں بھول گیا تو میں نے انہیں سے دریافت کیا۔ مرحومہ ایک علمی گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں یعنی ان کی والدہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مرحومہ نواب سید صدیق حسن خاں بھوپال کی نواسی تھیں اور ان کی گودوں میں کھیلی تھیں۔ اور ان کے والد سید احمد شہید کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مرحومہ کی بڑی بہن خود شاعرہ تھیں۔ انور تخلص کرتی تھیں۔ ان کا ایک شعر سن لیجیے۔

آتش عشق ہے کہ دوزخ ہے
فقنا ربنا عذاب النار

مولانا سید سلیمان ندوی نے کئی بار اس شاعرہ مرحومہ کو پیام نکاح بھیجا تھا۔ مگر انہوں نے تجرد کی زندگی میں عمر ختم کردی۔ اس علمی ماحول میں میری رفیقۂ زندگی نے پرورش پائی اور لکھنؤ کی ٹکسالی زبان تو ان کو ورثے میں ملی تھی۔ وہ میرے اندازے کے مطابق کم از کم بیس ہزار کتابیں ختم کرچکی تھیں۔ لیکن وہ اکثر و بیشتر یا تو قرآن اور کچھ وظائف کی کتابیں پڑھتی تھیں یا پھر ادبی کتابیں جاسوسی ناولوں سے انہیں بجا طور دل چسپی تھی۔ ہندو مسلمانوں میں کوئی لکھنے والا ایسا نہ تھا جس کے ادبی مضامین اور تصانیف ان کی نظروں سے نہ گذرے ہوں خواہ نظم ہو یا نثر۔ پھر ہر ایک کی نگارش پر آزادانہ تنقید کرتی تھیں۔ وہ بے تکلف یہ بھی بتادیتی تھیں کہ فلاں کی چوری ہے اور یہ فلاں کی نقالی ہے۔

محبوبیت

مرحومہ کی محبوبیت کا اندازہ مجھے ان کی وفات کے بعد ہوا۔ بے شمار ایسی عورتوں سے گھر بھر گیا تھا جن کو میں جانتا تک نہ تھا۔ ان کی علالت کے دوران بھی بہت سی عورتیں پابندی سے ان کے پاس آکر گھنٹوں بیٹھتی تھیں۔ سب سے تعجب مجھے اس وقت ہوا جب پروفیسر سید وقار عظیم کی بیگم نے ایک عجیب بات بیان کی۔ یہ دل کی مریضہ ہیں اور مرگ وغیرہ کا تصور بھی ان کو اختلاج میں مبتلا کرنے کے لیے کافی ہے۔ انہوں نے اپنے شوہر سے بیان کیا کہ: مجھے یہ زندگی میں پہلا گھر ملا ہے جہاں مرگ ہوئی اور مجھے کسی قسم کی وحشت نہ ہوئی۔ لاش کے پاس بہت سی عورتیں دیر شب تک بیٹھی رہیں وہاں سے اٹھنے کو دل نہیں چاہتا تھا اور ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی مرگ نہیں بلکہ شادی وغیرہ کی تقریب ہے۔

ریٹائرڈ تحصیل دار جناب محمود صاحب کی بیگم صاحبہ اور بہت سے لوگ میرے ساتھ نماز عید کے بعد مرحومہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گئے اور اس وقت میں نے دعائے مغفرت کے بعد باآواز بلند یہ دعا کی:

"خداوندا! میں ان سب لوگوں کو گواہ بنا کر اقرار کرتا ہوں کہ مرحومہ نے میرے ساتھ ساری عمر وفا کی ہے اور میں اس کا بھی اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے مرحومہ کے حقوق ادا کرنے میں بڑی بڑی

کوتاہیاں اور زیادتیاں کی ہیں اگر مجھے دس منٹ بھی پہلے یہ خطرہ ہوتا کہ یہ رخصت ہونے والی ہیں تو میں ان کے قدموں سے اپنی آنکھیں مل مل کر اپنی کوتاہیوں اور زیادتیوں کی معافی مانگتا۔ بار الہا! تو میری مرحومہ کی روح کو یہ توفیق دے کہ وہ مجھے معاف کردے"۔

اس کے بعد مجھ سے کچھ بولا نہ جاسکا۔ بیگم محمود میرے پاس روتی ہوئی آئیں اور کہا کہ: میری ایک وصیت کا پورا کرنا تمہارے ذمے ہے اگر میں یہاں تمہاری موجودگی میں مرجاؤں تو میری قبر مرحومہ باجی کے پہلو میں بنوا دینا۔ آپ اس سے اس محبت وعقیدت کا اندازہ کرسکتے ہیں جو بیگم صاحبہ کو مرحومہ کی ذات سے تھی۔

عجیب اجتماع

مرحومہ کے جنازے پر میرے مخلص دوست مولانا وارث کامل بی۔ اے مدیر چٹان موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ: میں نے لاہور کے کسی جنازے میں اتنے مکاتیب خیال کے پڑھے لکھے لوگوں کا اجتماع نہیں دیکھا ہے۔ محترم غلام احمد پرویز، ملک نصر اللہ خاں عزیز، جناب کوثر نیازی، جناب محمد طفیل، مولانا امام خاں، جناب عبادت بریلوی، جناب اثر صہبائی، جناب سید وقار عظیم، جناب پروفیسر ایم شریف (ڈائریکٹر ادارۂ ثقافت اسلامیہ) جناب بشیر احمد ڈار (رفیق ادارہ) مولانا عبدالرحمان طاہر سورتی، جناب عبدالصمد خاں مدیر استقلال وغیرہ جیسے مختلف مکاتیب فکر سے تعلق رکھنے والے حضرات کہاں یک جا ہوتے ہیں؟ شب کو ٹرنک کال ملتے ہی کراچی سے سید اکبر علی قاصد، سید عمادالدین رفاعی اور میری بڑی لڑکی تینوں بذریعہ طیارہ صبح پہنچ کر شریک جنازہ ہوئے میں اپنے بے شمار کرم فرماؤں کو بروقت اطلاع نہیں دے سکا۔ اہل تعزیت کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ان میں قابل ذکر میجر صادق (جو پہلے کیپٹن صادق تھے) بیگم خلیفہ عبدالحکیم، سابق میئر لاہور، میاں امیرالدین، سید نذیر نیازی اور ان کی والدہ وغیرہ ہیں۔

تعزیتی خطوط اور تار کا سلسلہ ابھی تک منقطع نہیں ہوا ہے۔ کلکتہ، پھلواری شریف، لکھنؤ، کانپور، بمبئی، بریلی، کراچی، لائلپور، بہاولپور، سکھر، لاڑکانہ، حیدرآباد، گوجرانوالہ، وزیرآباد، گورکھپور، جہلم، گوجرہ، ڈھاکہ، میکسیکو، لندن، جدہ اور خدا جانے کہاں کہاں سے بے شمار تعزیت نامے آئے ہیں ان سب کی شکر گزاری کے بعد یہ تاثرات ارسال کر رہا ہوں۔ ان میں تین تاروں کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ نواب سید شمس الحسن (نواب صدیق حسن خان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے پوتے) نے اردو میں تار دیا تھا۔

"دلی صدمہ ہوا۔ سب کو تلقین صبر"

عزیزم حسین عرب نے کراچی سے عربی زبان (انگریزی حروف) میں یہ تار دیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فکبتکم فکبتی. الھمکم اللّٰہ الصبر و السلوی ۔تمہاری مصیبت میں ہماری مصیبت ہے۔خدا تم سب کو صبر اور تسکین بخشے۔

مولانا غلام حسنین سلیمانی نے پھلواری شریف سے یہ تار دیا جو انگریزی ادب کا شاہکار ہے

(Inna Lillahwords Fail to Condole)

(اناللہ الخ۔تعزیت کے لیے الفاظ ناکام ہیں)

ہم دونوں عمر کی ایسی منزل سے گزر رہے تھے کہ ایک میں دوسرے کے لیے کوئی صوری کشش نہ تھی۔میری ۵۸ سال کی اور مرحومہ مجھ سے تقریباً چھ سال چھوٹی۔مگر یہ نکتہ اسی عمر میں آ کر سمجھا جا سکتا ہے کہ جنسی کشش محض نقطۂ آغاز ہے اور زوجی رابطہ دراصل وہ ہے جسے قرآن نے لتسکنوا الیھا اور جعل بینکم مودۃ ورحمۃ فرمایا ہے۔اصل رشتہ وہ ہے جس میں سکون، مودت اور رحمت ہے۔یہ نہ ہو تو زندگی جہنم ہے اور یہ ہو تو جنتی زندگی کا آغاز اسی دنیا سے ہو جاتا ہے۔

موت کی مصلحت

میں نے اور سارے صدمے سہے ہیں، والدین، اولاد، بھائی، بہن، دوست احباب وغیرہ کے صدمے دیکھے ہیں لیکن رفیقۂ حیات کے صدمے سے ناواقف تھا۔اب اس صدمہ کی نوعیت بھی حیطۂ علم و ادراک میں آ گئی۔سوچتا ہوں کہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو تو پہلے مرنا ہی تھا تو کیا مرحومہ کا پہلے مرنا ہی رحمت و خیر نہیں؟ دل کہتا ہے کہ یہی ٹھیک ہوا۔خدائے رحیم اپنے بندوں پر اس سے کہیں زیادہ مہربان ہے جتنی مہربان خود مرحومہ اپنی اولاد پر تھیں۔والدین محض بہانہ ہوتے ہیں ورنہ پرورش تو خدا ہی کرتا ہے۔سوچتا ہوں کہ اگر میں پہلے مرتا تو مرحومہ کا کیا حال ہوتا۔اچھا ہوا جو انہوں نے وہ وقت نہ دیکھا ورنہ وہ پاگل ہو جاتیں۔یا معلوم نہیں اور کیا ہوتا۔یہ میں یوں ہی نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ مجھے اس محبت کا اندازہ ہے جو مرحومہ کو اپنے بدقسمت شوہر سے تھی۔انہوں نے میری خاطر بڑے بڑے پیغام نکاح کو صاف رد کر دیا حتیٰ کہ والد بہ کے مرحوم شہزادے نے پیغام دیا جس کے مقابلے میں میری حیثیت ایک گدا سے زیادہ نہ تھی۔مگر مرحومہ نے اسے بھی صاف جواب دے دیا۔میں نے مرحومہ کو کبھی نہ دیکھا تھا نہ ان کو جانتا تھا۔پھر انہوں نے میرے ساتھ فقر و مسکنت کی زندگی گذارنے کو شاہانہ زندگی پر کیوں ترجیح دی! یہ ایک دلچسپ داستان ہے جو مرحومہ نے ازدواج کے بہت دنوں بعد مجھے خود سنائی۔ہم اس کا ذکر آگے کریں گے کہنا صرف یہ ہے کہ مرحومہ نے محض مودت و رحمت کے تقاضوں سے مجھے ہر ایک پر ترجیح دی اور یہ رشتۂ رحمت و مودت برابر اضافہ پذیر رہا۔اس لحاظ سے میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ میری موت ان کے

لیے زیادہ ناقابل برداشت ہوتی۔اور ان کا پہلے رخصت ہونا خود ان کے لیے بھی رحمت ہی ہوا۔

میرے احساسات

اس وقت مجھے اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ مرحومہ کہیں ملنے ملانے یا خرید و فروخت کرنے باہر گئی ہوئی ہیں۔اور بس اب واپس آیا ہی چاہتی ہیں۔معلوم نہیں کیوں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ مر چکی ہیں۔اس کے باوجود اندر سے ایک خلا بھی یقینی طور پر محسوس کرتا رہتا ہوں۔میری ساتوں لڑکیاں مجھ پر جان چھڑکتی ہیں میرے پانچوں داماد مجھے اپنا باپ سمجھتے ہیں اور میری کسی تکلیف کو برداشت نہیں کر سکتے۔دس نواسے نواسیاں میری زندگی کی رونق ہیں بظاہر کسی چیز کی کمی نہیں مگر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہوں وہ کیسے؟ کسی لمبی تمہید کے بغیر اسے سن لیجیے۔اب ایسا کوئی نہیں جس سے دل کی بات کہہ سکوں۔

وہ مجھے یاد آتی ہیں اور یاد آتی رہیں گی۔یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ کب کب یاد آتی ہیں۔آپ صرف یہ پوچھ سکتے ہیں کہ وہ کون کون ساعت ہوتی ہے جب وہ یاد نہیں آتیں۔کبھی کبھی تنہائی میں اپنی پوری سینتیس (۳۷) سالہ ازدواجی زندگی ایک فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے گردش کرتی ہوئی آتی ہے۔اور میں کسی ایک سین میں کھو کر رہ جاتا ہوں۔

ایک خاص بات اور بھی سن لیجیے، بے عیب ذات صرف خدا کی ہے مرحومہ میں ہماری طرح بہت سی کمزوریاں بھی تھیں جن پر میں انہیں ٹوکا اور جھڑکا بھی کرتا تھا لیکن آج قسم لے لیجیے، مجھے جب بھی وہ یاد آتی ہے تو اپنی بے شمار خوبیوں کے ساتھ یاد آتی ہے ان کا کوئی نقص ذہن میں نہیں آتا۔اب وہ ہر آن ایک معصوم مجسم کی شکل میں میرے سامنے آتی ہیں جس سے میں ایک ہی نتیجہ نکالتا ہوں کہ مرحومہ میں خوبیاں بہت زیادہ غالب تھیں اور میں زندگی میں جس قسم کی خردہ گیریاں کرتا تھا ان کی کوئی خاص حیثیت نہ تھی۔

ایک اور خلا

عام باپوں کی طرح میں بھی اپنی اولاد کو ڈانٹ پھٹکار کیا کرتا ہوں لیکن جس اولاد کی شادی ہو جائے میں اسے کچھ نہیں کہتا۔محض احتراماً ایسا نہیں کرتا بلکہ یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ اب میرا اس پر زیادہ حق و اختیار نہیں اور ایک خیال یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر اس نے برابر سے جواب دے دیا تو میں شاید آپے سے باہر ہو کر اس سے قطع تعلق کر لوں گا لیکن بیوی میری خفگی کو برداشت بھی کرتی تھی اور بعض [illegible] میری

© rasailojaraid.com